پروفیسر محمد حنیف

لسانی نظریات

جدید علم لسانیات (LINGUISTICS) کا سائنسی اسلوب پر مطالعہ گزشتہ تین صدیوں سے شروع ہوا ہے، لیکن اسے جدید علمی دریافت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا بلکہ زمانۂ قدیم میں بھی علم لسانیات یونانی علما کے ہاں فلسفیانہ بحث و نظر کا موضوع رہا ہے۔ مفکرین یونان نے زبان کے موضوع کو بہت اہمیت دی ہے اور افلاطون و ارسطو جیسے فلسفیوں نے اسے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد زبان کو بیرونی عناصر سے محفوظ رکھنا اور لغوی مداخلت کی راہیں بند کرکے زبان کی اصلیت کو برقرار رکھنا تھا تاکہ مذہبی تحریروں میں عدم اشتباہ زبان کی حفاظت کی ضمانت مہیا کرسکے۔

یہی نقطۂ نظر تقریباً اس زمانے میں ہندوؤں کے ہاں بھی کارفرما تھا۔ ہندوؤں کے عہدِ قدیم کے سب سے بڑے ماہرِ لسانیات پانینی نے اس زمانے میں فروغ پایا۔ پانینی کی تصنیف اشٹا ادھیائے (ASHTADHAYI) دنیا کی مختلف زبانوں میں قواعدِ لغت کی دست یاب کتابوں میں سے قدیم ترین ہونے کے علاوہ اس علم کی بہترین تصنیف سمجھی گئی ہے۔ اس کا مصنف برہمی رسم الخط کا قائل ہے۔ ہندی ادب و لسانیات میں لسانی تحقیق و مطالعہ کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا اور اس کا محرک بھی یہی امر تھا کہ ویدوں کی زبان کو بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے لسانیات کو فلسفیانہ بحث کا موضوع بنایا اور سنسکرت کے قواعد و قوانین کو فلسفیانہ انداز سے مدون کیا۔ ہندو دھرم کے لسانی تعصب کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ زمانۂ حال میں انھوں نے اردو اور ہندی زبانوں سے عربی مفردات کو خارج کرکے ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ داخل کرنے کی مہم چلائی اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اس تمام لسانی تحریک کے پس منظر میں مذہبی نقطۂ نظر کارفرما ہے، اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہبی رجحانات لسانیات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق و واقعات اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ زبان کے قوانین و قواعد کی فلسفیانہ

بحث اور اس پر سختی سے پابندی کے عمل کی اصل بنیاد مذہبی عقیدہ ہے اور نظریۂ زبان دراصل نظریۂ تقدسِ زبان ہے جس کا محور دینی کتب ہیں۔

اس طرح عربی زبان کی تدوین کے اوائل عہد میں مسلمان ماہرین لسانیات نے بھی اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے:

تعلموا اللحن (اللغۃ) والفرائض فانہ من دینکم[۱]

عربی زبان اور لغت کا علم حاصل کرو کیوں کہ اس کا تمھارے دین سے گہرا تعلق ہے۔

عربوں نے بھی عربی زبان کے قواعد و قوانین کو ضبط کرنے میں فلسفیانہ انداز اختیار کیا تاکہ کتب دینیہ میں استعمال ہونے والی زبان اپنی اصل حالت کو اس طرح برقرار رکھ سکے کہ زبان کی موشگافیوں یا قواعد کی کم علمی کے باعث احکامِ دین کی تشریح یا تفہیم میں کسی اشتباہ کا خطرہ نہ رہے۔ علمِ نحو کی ابتدائی تدوین کا جو ابوالاسود الدؤلی نے حضرت علی کے ارشاد کے مطابق کی، محرک یہی جذبہ تھا کہ ایک شخص تلاوتِ قرآن میں اعرابی غلطیاں کر رہا تھا، آپ نے اس کی اصلاح کے لیے نحو کے چند ابتدائی قواعد بیان فرمائے[۲]۔ قلقشندی لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین عربی کی تعلیم و تعلم پر مسلسل زور دیتے رہے کیوں کہ یہ دین کی زبان ہے[۳]۔

الغرض اہلِ دین ہمیشہ اس امر پر حریص رہے ہیں کہ دینی کتب کسی تحریف یا تبدیلی کے شائبہ سے پاک اپنی اصلی حالت میں باقی رہیں، اور اس کی ضمانت صرف اسی طرح فراہم کی جا سکتی ہے کہ جس زبان میں یہ دینی کتب تحریر ہیں اس کو واضح، ستھری، شستہ اور الفاظِ دخیلہ سے پاک رکھا جائے، جیسے وہ زبان گویا ایک دینی تاریخی وثیقہ ہے جسے کوئی سے بھی حالات ہوں، چھونے کا کوئی جواز نہیں۔

چنانچہ اسلامی ادب کے اللقایں علمائے لسانیات نے زبان کے مصادر کی تحقیق اور ان کی صحت و روایت کے ثبوت کے سلسلے میں جدت پیدا کی اور اس غرض سے ایک باقاعدہ علم ایجاد

۱؎ قلقشندی، صبح الاعشیٰ، خطبہ الامیر القاہرہ ۱۹۱۳ء، ۱۴۸

۲؎ ملاحظہ ہو ایضاح المطالب علی الکافیہ بن الحاجب، دیوبند، مقدمہ، ص ۱

۳؎ قلقشندی، صبح الاعشیٰ، القاہرہ ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۶۸

کیا جس کے قواعد و اساس اس نقطے پر مرکوز ہیں کہ روایات میں سے ثقہ روایت اور رواۃ میں سے ثقہ راوی کی تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد استشہاد و استدلال کے لحاظ سے کلامِ عرب کی تقسیم کی گئی جس کا مرکزی نقطہ بے معنی روایات، اختلافِ تعبیر اور کلماتِ دخیلہ یا مشکوک کلمات سے عربی زبان کو محفوظ اور صاف رکھنا تھا۔ اس میں علمائے زبان میں سے کچھ تو زیادہ متشدد تھے اور کچھ ذرا کم۔[۱] در اصل اس کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ حرمتِ زبان اور تقدیسِ زبان کے ضمن میں کون کتنا زیادہ اعتقاد رکھتا ہے۔

مگر اس فرق کے باوجود ماہرینِ علمِ زبان کا اس پر اجماع نظر آتا ہے کہ زبان کے قواعد و استعمال کا معاملہ دین کے اوامر و نواہی کی طرح ہے جس طرح دین کے اوامر و نواہی میں کسی خلاف ورزی کی گنجائش نہیں اسی طرح زبان کے قواعد و احکام سے پہلو تہی کی بھی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، حتیٰ کہ ان میں تبدیلی یا لچک کا خیال کرنا بھی غلط ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اختلاف تو ہو سکتا ہے مگر یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ احکامِ قرآن، اس کی تفسیر اور معانی کی تشریح کے سلسلے میں مسلمانوں کی احتیاط اور توجہ میں شدت کا عربی زبان کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے۔

علوم ادب کی تقسیم میں عربوں نے چھ اصطلاحات قائم کی ہیں۔

(۱) اللغۃ (۲) الصرف (۳) النحو (۴) المعانی (۵) البیان (۶) البدیع

پہلے تین علوم کے ضمن میں عربوں کے فصیح کلام کے علاوہ اور کہیں سے شہادت قبول نہیں کی جاتی، جب کہ باقی تین کے ضمن میں کلامِ عرب یا غیر عرب کے کلام سے بھی استشہاد جائز ہے۔ اس میں عرب اور غیر عرب کی تمیز نہیں کی جاتی، کیوں کہ اس کا معاملہ عقل کی طرف راجح سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس میں بحتری، ابو تمام، متنبی اور اس قبیل کے دوسرے شعرا کے کلام سے شہادت کو قبول کیا گیا ہے جو کہ شعرائے مولدین کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی وہ شعر جن کا عجمیوں یا اجنبی لوگوں سے میل جول رہا اور اس وجہ سے ان کی زبان میں اجنبی الفاظ داخل ہونے کے اندیشے کے پیشِ نظر معروف کلامِ عرب سے ان کو بغرضِ احتیاط خارج سمجھا گیا، اور اس بنا پر علوم ادب کی

---

[۱] عبدالرحمٰن السید، مدرسۃ البصرۃ النحویہ، منشاتہا و تطورہا، دار المعارف، مصر، ص ۳۔ ۱۱ ملخصاً
اسی نقطۂ نظر سے جلال الدین السیوطی نے "المزہر فی علوم اللغۃ و انواعہا" اور جوالیقی نے "المعرب من الکلام الاعجمی علی الحروف المعجم" تصنیف کیں۔

پہلی تین اقساط میں ان کے کلام سے شہادت کو صحیح نہیں سمجھا گیا۔ یعنی لغت، صرف اور نحو کے ضمن میں اس گروہ سے متعلق بڑے بڑے شعرا مثلاً بحتری، بشار بن برد، ابو تمام، ابو نواس اور متنبی کے کلام سے بھی استشہاد کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ اس میں ایک اور اہم عنصر کا بھی دخل ہے اور وہ یہ کہ ان عظیم شعرا کے زمانے اور زمانۂ جاہلیت کے درمیان طویل دور حائل ہے، اور خالص معتبر اور ستھری زبان کے لیے زمانۂ جاہلیت ہی کو متفقہ طور پر سند قرار دیا گیا، اور جتنا جتنا وقت اس دَور سے دُور ہے اتنا ہی اس دَور کی زبان کے خالص ہونے میں شبہے کی گنجائش پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حالانکہ شاعری اور زبان و ادب میں ان شعرا کی عظمت اور قدر و منزلت مسلمہ ہے۔ یہ امر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ زبان کے اوامر و نواہی کی پابندی دین کے اوامر و نواہی کی طرح کی گئی ہے۔[۵]

شعرا کے کلام سے استشہاد کے ضمن میں شعرا کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ جاہلی شعرا : جو زمانۂ جاہلیت یعنی قبل از اسلام میں ہو گزرے ہیں اور جن کی شاعری کو آج تک بلاغتِ کلام میں مثالی حیثیت حاصل ہے۔ یوں کہ اس وقت تک عربی زبان میں عجمی اثرات کی دراندازی کے امکانات نہیں تھے۔ نیز بالعموم عرب بادیہ نشین تھے اور شہری زندگی سے دور رہتے تھے، جب کہ زبانیں شہروں میں مختلف علاقوں کے رہنے والے لوگوں کے باہمی امتزاج سے متاثر ہوتی ہیں، اس لیے جاہلیت کی زبان کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ البتہ کہیں کہیں ہم ان کے کلام کو نامعلوم اور عسیر الفہم محسوس کرتے ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس معاشرے اور اس دور کی معاشرتی روایات سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہیں۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں امراء القیس، طرفہ، زہیر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

۲۔ مخضرمون : وہ شعرا جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے ہیں جیسے حضرت حسان بن ثابت اور خنسا وغیرہ۔ ایسے شعرا جنھوں نے اسلامی عہد تو پایا ہے لیکن ان کی شاعری دورِ جاہلیت سے تعلق رکھتی ہے، انھیں بھی بعض محققین نے پہلی قسم میں شمار کیا ہے مثلاً

---

۵ قلقشندی، صبح الاعشیٰ، القاہرہ ۱۹۱۳ ۱ : ۱۹۷ - ۱۸۰ و عبدالرحمٰن طاہر سورتی تاریخ ادب عربی (ترجمہ) فٹ نوٹ ص ۴۰۶

لبید اور امیہ بن ابی الصلت وغیرہ۔

۳۔ اسلامیون : وہ شعرا جو صدرِ اسلام میں ہوگزرے ہیں جیسے جریر، فرزدق وغیرہ۔

۴۔ مولدون یا محدثون : یہ وہ شعرا ہیں جو صدرِ اسلام کے بعد کے دَور سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں لسانی ملکہ اور اسنادی حیثیت کمزور تھی، البتہ انھوں نے اضافی صنعتوں سے شعر کو حسن و خوبی عطا کی، اس گروہ میں شعرائے بنی عباس کو شمار کیا جاتا ہے۔

پہلے دو طبقوں کے شعرا کے کلام سے استشہاد کسی نزاع یا اختلاف رائے کے بغیر قبول کی جاتی ہے، مگر صحتِ استشہاد کے لحاظ سے تیسرے طبقے کے شعرا کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ متشدد علمائے زبان مثلاً ابوعمر بن العلا اسلامی طبقے کے کسی شاعر کے شعر کی صحت کو نہیں مانتے سوائے اس استثنا کے کہ وہ متقدمین میں سے کسی شاعر کا شعر ہو۔ مگر جہاں تک چوتھے طبقے کے شعرا کا تعلق ہے ان کے شعر سے استشہاد کی عدم صحت پر اتفاق ہے[۵۶]

بعض علمائے ادبیات نے مولدین اور محدثین شعرا کے درمیان تفریق کی ہے۔ انھوں نے مولدین کو چوتھا طبقہ قرار دیا ہے، اور یہ وہ حضرات ہیں جو جاہلی، مخضرمی اور اسلامی شعرا کے زمانی اعتبار سے قریب ہیں، اور محدثین کو پانچواں طبقہ قرار دیا ہے جس میں بحتری اور ابوتمام وغیرہ کو رکھا گیا ہے جب کہ ایک چھٹا طبقہ متأخرین کے نام سے قرار دیا ہے جس میں متنبی کو شامل کیا گیا ہے مگر اس تقسیم در تقسیم کے عمل کے باوجود متأخر الذکر طبقوں کے شعر سے عدم استشہاد کی رائے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شعر و شاعری کے علاوہ دیگر لغوی مصادر میں قرآنِ حکیم، احادیثِ نبویہ، خطب اور ضرب الامثال ہیں۔ قرآن حکیم ایک ایسا مرجع ہے جو فصاحتِ لسانی کے معیارِ کمال کی انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بابِ استشہاد میں جو مقام قرآنِ حکیم کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے مرجع کو حاصل نہیں۔ قرآنِ حکیم لغتِ قریش میں نازل ہوا جو دیگر تمام عربی لہجات میں افصح تھی۔ اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامی تقاضوں کے تحت دیگر لہجات میں بھی قرآن حکیم کی تلاوت کی اجازت دے دی تھی، لیکن قرآن کی تدوین

---

۵۶ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو السباعی، السباعی، تاریخ الادب العربی فی صدر الاسلام والعصر الاموی۔

قریش کے لہجے کے مطابق ہی ہوئی[۷]

قرآن حکیم کے الفاظ اور تعبیرات کے ضمن میں یہ ایک بحث پیدا ہوئی ہے کہ قرآنِ حکیم میں عجمی الفاظ کا وجود ہے یا نہیں۔ بعض علمائے لغت کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی زبان عجمی تداخل سے پاک ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے خود اپنے بارے میں " قرآناً عربیاً " اور " لسانٌ عربیٌ مبینٌ " کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن کی زبان عجمی الفاظ کے وجود سے پاک ہے۔ لیکن ابنِ عباس، عکرمہ، مجاہد، ابن جبیر، عطار اور دیگر اہلِ علم فقہا کئی الفاظ کو عجمی الاصل بتاتے ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، الیم، الربانیون، الطور سریانی الاصل ہیں۔ الصراط، القسطاس، الفردوس رومی الاصل ہیں، مشکوٰۃ اور کفلین حبشی الاصل ہیں اور ہیت لک حورانی زبان کا لفظ ہے۔ ابوعبیدہ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ نزاع لفظی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اصلاً یہ الفاظ عجمی ہیں لیکن اہلِ عرب ان سے متعارف ہوئے تو انھوں نے انھیں عربی قوالب میں ڈھال کر عربی بنا لیا اور قرآن نے انھیں عربی الفاظ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے[۸] امام فخر الدین رازی اور جوالیقی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے[۹] زیات کے خیال میں ایک سو سے زاید کلمات ایسے ہیں جو عجمی الاصل ہیں، لیکن عربوں نے انھیں صیقل کر کے اپنے اوزان پر ڈھال لیا ہے اور قرآن نے انھیں عربی الفاظ کے طور پر استعمال کیا[۱۰]

اس تمام بحث کے باوجود تمام علما کا قرآن حکیم کے ان الفاظ سے استشہاد پر اتفاق ہے۔ اسلامی عہد میں قرآن حکیم کے بعد جو چیز سب سے زیادہ عربی زبان پر اثر انداز ہوئی وہ احادیثِ نبویہ ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی لغت پر قدرتِ تامہ، اسالیب کی مہارتِ کاملہ، زبان و بیان کی بلاغت، پاکیزگیٔ فکر و احساس کے ساتھ ساتھ الہامی فصاحت کی تائید کی وجہ سے ایسی

---

[۷] نظام الدین القمی، تفسیر مراتب الفرقان، بولاق ۱۳۲۳، ص ۲۴

[۸] ایضاً

[۹] جلال الدین سیوطی، المزہر فی علوم اللغۃ و انواعہا، القاہرہ، ۱ : ۲۶۸ - ۹

[۱۰] جوالیقی، ابومنصور، المعرب من الکلام الاعجمی علی الحروف المعجم، القاہرہ ۱۳۶۱ ـ ص ۵

صلاحیتوں سے مالا مال تھی جو آپ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ آپؐ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد بن بکر کے ہاں پرورش پائی، لہذا قدرتی طور پر آپ تمام عربوں سے زیادہ فصیح تھے۔ آپؐ نے خود فرمایا:

أنا اعربکم ، أنا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر [۱۱]

میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد بن بکر کی زبان ہے۔

ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اعطیت جوامع الکلم [۱۲]

مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے۔

جہاں آپؐ نے عربی زبان کو جامع اصطلاحی الفاظ عطا فرمائے وہاں آپ کے کئی ایک اقوال ضرب الامثال بن گئے۔ مثلاً

مات حتف انفہ

وہ اپنی ناک سے دم توڑ کر مرگیا۔ یعنی طبعی موت مرگیا۔

الآن حمی الوطیس

اب بھٹی تیز ہوگئی۔ یعنی جنگ بھڑک اٹھی۔

قرآن و حدیث کے علاوہ عربی زبان میں گراں قدر مستند ذخیرہ ضرب الامثال اور خطبات کا ہے۔ اگرچہ جاہلی دور کے عربوں نے نثر کو جمع کرنے میں چنداں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ صبح الاعشی کا مصنف لکھتا ہے کہ:

عرب شہریوں اور بدوؤں کی عمدہ نثر اور بلیغ خطبات کی مقدار ان کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں؛ لیکن فرق یہ ہے کہ نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہیں رہا، جب کہ شاعری کا دسواں حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ خطیب عام طور پر بادشاہوں کے سامنے یا لڑائیوں کے وقت یا متحارب گروہوں

---

[۱۱] ابوداؤد، سنن، کتاب الصلوٰۃ، ابواب الحجۃ والخطبۃ

[۱۲] غزالی، احیاء علوم الدین، ۲: ۲۶۴، قاضی عیاض، الشفا، القاہرہ، ۱: ۴۷

میں صلح کرانے کے لیے یا مجلسِ نکاح وغیر کے موقعے پر خطبہ دیا کرتے اور جب وہ موقع گزر جاتا تو کچھ لوگ اسے یاد رکھتے اور کچھ بھول جاتے، اس کے برعکس اشعار میں سے ایک بیت بھی ضائع نہ ہوتا[۱۳]

بہرحال علمائے لغت نے ضرب الامثال اور خطبات کو جمع کر کے ان کی شرحیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں ضرب الامثال پر سب سے پہلے کامیاب کوشش المیرانی (م ۵۱۸ھ) کی ہے جس نے اپنی تمثیل مجمع الامثال تقریباً پچاس مجموعوں کی مدد سے تیار کی، اس میں امثال حروف ہجا کی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں[۱۴]

خطبات کے نمونے تاریخ ادب کی متعدد کتابوں میں ملتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے خطبا میں قس بن ساعدہ الایادی، عمرو بن کلثوم التغلبی، اکثم بن صیف التمیمی، حارث بن عباد البکری، قیس بن زہیر العبسی، عمرو بن معدیکرب الزبیدی مشہور ہیں۔ اسلامی عہد کی خطابت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبا کو نئے اسالیب اور جدید آہنگ سے روشناس کرایا۔ آپ کے بعد حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی بن ابی طالب، زیاد بن ابی سفیان اور حجاج بن یوسف نامور خطبا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں[۱۵]

الغرض مسلمان علمائے لسانیات نے عربی زبان کی پاکیزگی، اس کی اصل صورت اور فصاحت کو قائم و دائم رکھنے کے لیے جو قواعد و ضوابط وضع کیے اور جس محنت سے مختلف علوم زبان ایجاد کیے اور جس شدت سے ان پر عمل پیرا رہے، دیگر ادیان کی دینی و الہامی کتب کی زبانوں کی حفاظت کے سلسلے میں کیے گئے اقدامات ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

---

۱۳ قلقشندی، صبح الاعشی، ج ۱، ص ۲۱۰

۱۴ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، المعارف استانبول، ص ۱۵۹۷

۱۵ حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ نہج البلاغہ کے نام سے معروف ہے۔ مصر کے نامور سکالر شیخ محمد عبدہٗ نے اس کی شرح لکھی ہے۔